**سمیرا عمر**
لیکچرر شعبہ اردو،
گورنمنٹ پوسٹ گریجویٹ کالج برائے خواتین سرگودھا

# محمد الیاس کے ناول بارش میں نسل کا تصور

The bases of human societies are as many as there are societies in the world. An agricultural society, like ours usually determine its social hierarchy on racial basis. The social determinants of a society shape the world view of its people. The writer also gets impressions from these determinants. Muhammad Ilyas while presenting the characters in his novels uses the racial variable to determine their traits. His novel Barish is analysed in this article.

کرداروں کی شخصیت کی بنیاد کیا ہے؟ یہ ایسا سوال ہے، جو ہر ناول نگار کے پیش نظر رہتا ہے۔ ناول نگار اپنے تجربے اور تخیل کو کام میں لاتے ہوئے اور ناول کے تھیم کی ضرورت کے پیشِ نظر کردار کی شخصیت کو بناتا ہے۔ کردار کی پیش کش کے دوران وہ اس کی شخصیت کے اسی پہلو کو سامنے لاتا ہے، جو کردار کی انفرادیت بھی قائم کرے اور اس سے اس کی شخصیت بھی کھل کر سامنے آئے۔ کردار کی شخصیت کو سوچتے ہوئے خود ناول نگار کا اپنا سماجی تجربہ بھی اثر انداز ہوتا ہے۔

برصغیر کا سماج زرعی ہے۔ اس سماج کی خاص بات ذات پات کا نظام ہے۔ اس نظام میں پیشے اور زمین کی ملکیت کو خصوصی اہمیت حاصل ہے۔ اسی اہمیت کے پیش نظر سماج میں مختلف درجات کے حامل اشخاص نظر آتے ہیں۔ صدیوں کے تجربے نے یہاں افراد اور ان کی نسل سے متعلق کئی طرح کے تصورات جنم دیئے ہیں۔ ان تصورات میں ''نسل'' کا ''اخلاص'' خصوصی اہمیت کا حامل ہے۔ ''نجیب الطرفین'' ہونے کو یہاں بہت اہم سمجھا جاتا ہے۔ کسی شخص کی اہمیت کا اندازہ اس کی نسل سے لگایا جاتا ہے۔ اسی طرح ہر نسل اور ذات کے حوالے سے مخصوص تصورات برصغیر کی زندگی کا لازمی جزو بن گئے ہیں۔ جس کا نتیجہ ہے کہ کسی فرد کی پہچان اور اس کے طرزِ عمل کے بارے محض ذات کی بنیاد پر ہی کی جانے والی قیاس آرائی کو حقیقت کا درجہ دیا جاتا ہے۔

محمد الیاس کا تعلق راجپوت خاندان سے ہے۔ ان کے کرداروں کی شخصیت کا نمایاں وصف بھی ذات پات یا نسل ہے۔ وہ جب بھی کرداروں کو پیش کرتے ہیں، تو ان کی ذات برادری ضرور بتاتے ہیں۔ ان کے اسلوب کی یہ خاص بات ہے۔ یہ وصف محض انسانوں تک محدود نہیں۔ ان کے ہاں یہ رجحان اس حد تک پایا جاتا ہے کہ کسی جانور کا ذکر ہو یا کسی پودے کی بات وہ اس کی نسل بتانا نہیں بھولتے۔ اس پہلو پر مزید تفصیل سے روشنی ڈالنے کے لیے ان کے ناول بارش سے مختلف مثالیں لے کر ان کا جائزہ لیا جائے گا۔

اس ناول میں نسل یا ذات پات کا تصور بے حدا ہم ہے ۔ہر کردار کا تعارف کرواتے ہوئے اس کی ذات کے بارے میں ضرور بتایا گیا ہے ۔اس ذات سے منسوب جو صفات ہیں ان کا تذکرہ بھی بیان میں شامل ہے۔ مثلاً صحرائی صابر اور شتر کینہ رکھتے ہیں۔ ایسا خی قبیلے کی عورتوں کا حسن مشہور ہے، جھیوری قوم کی کمین اور حلال وحرام میں تفریق نہیں کرتے، جٹ بہت اکھڑا اور وفادار ہیں۔ اڑوت قوم بدلہ لینے میں اپنا ثانی نہیں رکھتی ، گوندل بار کے مقامی لوگ مرد اور عورت کے چھپ کر ملنے کو زنا کاری ہی تصور کرتے ہیں۔ الیاس کے ہاں ذات پات کی اہمیت اس قدر زیادہ ہے کہ جانوروں کا ذکر آنے پر وہ اس کی ذات ضرور بتاتے ہیں۔گھوڑے کے بیان میں وہ سمند ،تلیا ،سرنگ،ابلق ،ابرش، چتکبرا اور مشکی کا ذکر کرتے ہیں، کتوں کے ذکر پر وہ وولف ڈاگ، جرمن شیفرڈ ،گدی، بوہلی، پنیر اور گلٹر یا کی نسلی خصوصیات گنوا دیتے ہیں۔ اسی طرح پودوں کا ذکرکر تے ہوئے کیکر اور جیڑ کے درختوں کی مثال سے ان کے علاقوں کے لوگوں کا مذاق ،مزاج اور عادات کا فرق سمجھا دیتے ہیں کہ کرخت ،سخت جان ،متکبر،خوش رو اور ہٹیلے ہیں ۔

محمد الیاس اپنے کرداروں کی پیش کش میں ''نسل'' بتانے میں خاص توجہ دیتے ہیں۔ اس کی ایک وجہ تو خود برصغیر کی سماجی صورت حال ہے۔ جہاں ہر فرد کی پہچان اس کی نسل سے ہوتی ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ محمد الیاس کے اپنے ادراک میں یہ بات بہت گہری بیٹھی ہوئی ہے۔ یقیناً انھوں نے بچپن سے یہی دیکھا ہے کہ کوئی بھی شخص اولاً اپنی نسل سے پہچانا جاتا ہے۔ اس کی بنیادی خصوصیات کا تعین بھی نسل ہی کرتی ہے۔ دوسری اہم وجہ یہ ہے کہ جس سماج کی نمائندگی وہ اپنے ناولوں میں کر رہے ہیں، ان سب کا تعلق زرعی سماج اور شہروں میں آنے والے دیہاتی پس منظر کے حامل افراد سے ہے۔ زرعی سماج کی بدولت ان سب کرداروں کے ہاں نسل ایک اہم قدر ہے۔ محمد الیاس کے ناولوں میں اس مظہر کی مختلف صورتیں نظر آتی ہیں۔

اگر نسل کی پیش کش کو سامنے رکھا جائے تو الیاس کے ناولوں میں درج ذیل پہلو سامنے آتے ہیں۔ ایک تو نسل کی تصوراتی سطح ہے۔ ان کے ناولوں میں اولادِ آدم دراصل دو بنیاد نسلوں میں منقسم ہے: حاکم اور محکوم۔ ان کے مطابق جتنی بھی نسلیں ہیں ، ان کے جس قدر نام ہیں اور ان سے جتنی بھی خصوصیات منسوب ہیں، سب کو انھی دو بنیادی زمروں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ الیاس کے نالوں میں ''نسل'' محکومی کا جواز بن کر سامنے آتی ہے۔ وہ دکھاتے ہیں کہ قدرتی آفات بھی اگر نقصان پہچانتی ہیں تو صرف محکوموں کو۔ بقول مہذب لکھنوی

دو چار بس غریبوں کے آشیاں جلائے
گلشن میں بجلیاں بھی گریں دیکھ بھال کے

کچھ ایسی ہی بات وہ اپنے ناول بارش میں لکھتے ہیں۔ وہ دکھاتے ہیں کہ کس طرح طوفانی بارش کے بعد بستی سے سیلابی ریلا تباہی مچاتے ہوئے گزر گیا۔ اس مقام پر وہ ایسے افراد پر طنز کرتے ہیں، جو قدرتی آفات کو اخلاقی برائیوں کی سزا قرار دیتے ہیں۔

''سیانے کہنے لگے کہ لوگوں کے گناہوں کی سزا ملی ہے۔ تب یہ بھید کھلا کہ قبیح ترین گناہ جھونپڑوں، کچے

گھروندوں اور نیم پختہ مکانوں میں ہی سرزد ہوا کرتے ہیں۔ گویا محلوں، حویلیوں، چوباروں اور برج مناروں میں برکھا رُت منانے کے لیے رات بھر جمنے والی ناؤ نوش اور طرب و نشاط کی رنگا رنگ محفلوں سے خندہ رُو صاحبِ قدرت نے صرفِ نظر کرتے ہوئے خشم ناک مظاہر کا رُخ موڑ دیا تو راہ میں آئے نادار اور بے کس انسان، ممکنہ گناہوں کی پاداش میں غیظ و غضب کا نشانہ بن گئے۔''[1]

یہ اقتباس انسانوں کو معاشی بنیاد پر دو گرہوں میں تقسیم کرتا ہے اور پھر اخلاقی توجیہہ پر سوال اٹھاتا ہے کہ اگر گناہوں کی سزا دینے کے لیے ہی قدرتی آفات برپا ہوتی ہیں تو اس کا نشانہ غربا اور مساکین ہی کیوں بنتے ہیں۔ جو لہوولعب میں مبتلا ہیں، ان کے محل محفوظ رہتے ہیں اور نانِ جویں کو ترسنے والے، کچے مکانوں کے بے نوا، قدرت کے غیظ و غضب کا شکار ہوتے ہیں۔ ان کے لیے تو ناکردہ گناہوں پر بھی سزا ہے۔ ''ممکنہ'' کے لفظ سے الیاس نے اس بے بنیاد اخلاقی تعبیر پر سوال اٹھایا ہے کہ جو گناہ کرتے ہیں، وہ اپنے مامن میں محفوظ رہتے ہیں، بلکہ ان کے لیے برسات محفلیں جمانے اور لطف اٹھانے کا سبب بن گئی ہے اور ازلی بھوکوں پیاسوں کے لیے پانی قیامت ڈھا رہا ہے۔ اس صورتِ حال پر الیاس نے قطعیت سے لکھا کہ ''اولادِ آدم کے دو ہی طبقے ہیں، ظالم اور مظلوم۔ اس ایک ہی کسوٹی پر دوزخ اور جنت دونوں ہاؤس فل رہیں گی۔''[2]

نسل کی محکومی کا اظہار الیاس کے ناول بارش میں کئی صورتوں میں سامنے آتا ہے۔ سب سے پہلے تو کردار کا حلیہ اور وضع قطع اس کی نسلی کم تری کا نشان بن کر ابھرتے ہیں۔ وہ ایک کردار کے حلیے کے بارے میں لکھتے ہیں: ''مہرو کا وہی حلیہ تھا، جو اس غلام نسل کے بچوں کا آج بھی ہوا کرتا ہے۔''[3] اگر ایک طرف الیاس کے ناولوں میں نسلی محکوموں کا بیان ملتا ہے، تو دوسری طرف نسل بعد نسل حاکم رہنے والوں کے طرزِ زندگی کو بھی انھوں نے بہ تفصیل بیان کیا ہے۔ اس حوالے سے وہ دکھاتے ہیں کہ کس طرح حاکم اپنے طرزِ زندگی میں تعیش اور دولت کی فروانی سے ایسی علامتیں جمع کرتے ہیں، جو ان کے حاکمانہ تسلط کا رعب محکوموں پر قائم رکھیں۔ اس حوالے سے اونچے محل، سنگ مرمر کے فرش دور دراز ملکوں سے خریدا گیا مہنگا آرائشی سامان، کئی طرح کا فرنیچر اور سب سے بڑھ کر کھانے کی ایک بڑی میز جس پر کھانے کے دوران طرح طرح کے پکوان سلیقے سے چنے ہوتے ہیں۔ انہوں نے لکھا ہے:

''رنگ، نسل زبان اور مذہب سے قطع نظر، سردار قبیل کے ہر خاندان کے بیش تر مردوں کے خاندانی ہونے کا تقاضا ہوا کرتا تھا کہ ... دستر خوان وسیع ہو۔ عام لنگر کا اہتمام بھی ضروری تصور کیا جاتا تھا تاکہ مفت بروں کے علاوہ غلاموں کا بھی ہجوم رہے۔ جو گالیاں اور جوتے کھا کر دعائیں دیں اور آدابِ غلامی کی صدیوں پرانی روایت کو آگے بڑھاتے رہیں۔''[4]

اس اقتباس کی خاص بات سخاوت اور خیرات کے کاموں کا استعمال ہے۔ اقبال نے خوب توجہ دلائی تھی کہ اہلِ ثروت، غریبوں کو زکوٰۃ دیتے ہوئے جس رویے کا مظاہر کرتے ہیں، اسی رویے کی طرف الیاس اس پیراگراف میں اشارہ کر رہے ہیں۔ یہاں سخاوت اور لنگر کا اہتمام محض غریبوں اور محتاجوں کی مدد کے لیے نہیں کیا جا رہا، بلکہ اس کا مقصد حاکم

اور محکوم کے درمیان پائے جانے والے فرق کو اور زیادہ نمایاں کرنا ہے۔ یہ امر لائق توجہ ہے کہ دستِ دولت آفریں کو مزد کی بجائے خیرات ملتی ہے۔ اس خیرات کا نتیجہ ہے کہ محکوم ہمیشہ حاکموں کے احسان مند رہتے ہیں۔ بارش میں محمد الیاس نے دکھایا کہ کس طرح اعلیٰ نسلیں صرف انھی لوگوں کی مدد میں دل چسپی لیتی ہیں، جو انھیں بطور آقا تسلیم کریں۔ انھوں نے ایک کردار سردار وقار احمد پر طنز کرتے ہوئے لکھا کہ اس کی دریا دلی ''صرف ان افراد کے لیے اچھلا کرتی جو زر خرید غلاموں کی روایت کا پاس رکھتے ہوئے اپنی عزتِ نفس، غیرت اور حمیت کو اس کے قدموں میں ڈال دینے کا صدیوں پرانا سلیقہ رکھتے ہوں۔''(۵) اس طرح سخاوت غریبوں کی حمایت کی بجائے، اپنے حمایتی اور کاسہ لیسی پیدا کرنے کا ذریعہ بن جاتی ہے۔ محمد الیاس اس طرح کی نسلی محکومی پر بار بار طنز کرتے ہیں۔ وہ انسانوں کو غربت کی لکیر سے نیچے زندگی گزارتے ہوئے دیکھتے ہیں، تو ان کے قلم سے المناکی اور مزاحمت کے پہلو برآمد ہوتے ہیں۔ وہ جاگیرداری اور اس کے ناسور کا پردہ چاک کرتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں: ''ہر فیوڈل لارڈ ایسا ہی ہوتا ہے، سسٹم بچائے رکھنے کے لیے اس طرح کی سخاوت ضروری ہوتی ہے۔ پہلے عام لوگوں کے حقوق غصب کرو اور پھر اپنی صوابدید پر سخاوت کرتے پھرو۔''[۶]

نسلی محکومی کے مختلف مظاہر اور نمونوں کو الیاس نے اپنے ناول بارش میں تفصیل سے بیان کیا۔ اس ناول میں مثال کے طور پر تمام ملازم نسلی ہیں، جو سردار خاندان کے ساتھ پشت ہا پشت سے بطور غلام منسلک ہیں۔ سردار خاندان بھی انھی ملازموں پر بھروسہ کرتا ہے۔ یہ ملازم مالک کے ایک اشارے پر جان لے بھی سکتے ہیں اور جان دے بھی سکتے ہیں۔ اگر ان کی عورتوں کے ہاں مالکوں کے بچوں کی پیدائش ہو جائے، تو اسے بھی گوارا کرتے ہیں۔ ایسے بچے یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ مالکوں کے خون اور لونڈیوں کے بطن سے ہیں، اپنی غلامانہ حیثیت کبھی نہیں بھولتے۔ ان خدمت گار مردوں اور عورتوں کی نسل اور سردار خاندانوں کی جاگیرداری ہم عمر ہیں۔ دونوں ساتھ ساتھ پروان چڑھے ہیں۔ جاگیردار اپنے معمولی سے لے کر غیر معمولی کام تک، سب خدمتیں انھی خاندانی ملازمتوں سے لیتے ہیں۔ یہ عادت فطرتِ ثانیہ بن چکی ہے۔ ملک کے اندر کا سفر درپیش ہو یا کہیں بیرون ملک جانا ہو، سفر سیاحت کا ہو یا عبادت کا، یہی خانہ زاد غلام ان جاگیرداروں کے ساتھ رہتے ہیں۔ یہ ملازم ایسے ہیں کہ ان کے کھانے پینے، پہننے اور اوڑھنے رہنے اور علاج معالجے سب کی ذمہ داری مالکوں پر ہوتی ہے۔ یہ ویسے ہی ملازم ہیں، جیسے مثلاً امراؤ جان ادا میں جب نواب سلطان ایک خان صاحب کو پستول سے زخمی کر دیتے ہیں، تو ان کا ملازم یہ اقدام اپنے سر لے لیتا ہے۔ اس ناول میں بھی غلام اپنے آقا کے لیے جرائم کی ذمہ داری اپنے سر لے لیتے ہیں۔ ان کی حیثیت اس حوالے بھی اہم ہے کہ گھر کے افراد میں ایک دوسرے کے حوالے سے جو بھی سازش چل رہی ہو یہ اس کے راز دار ہوتے ہیں اور کبھی زبان نہیں کھولتے۔ الیاس لکھتے ہیں کہ یہ لوگ ''دین، مذہب اور خدا بھی آقا ہی کو سمجھتے ہیں۔''[۷] الیاس شاید یہ دکھانا چاہتے ہیں کہ غلامی کی یہ لعنت اسی وقت قائم ہوتی ہے، جس وقت کوئی فرد غلامی قبول کرے۔ الیاس غلامی کی ایک اہم وجہ کو سامنے لاتے ہیں۔ جب تک کوئی محکوم غلامی قبول نہیں کرے گا، تب تک غلامی قائم نہیں ہو سکتی۔ یہ غلامی کا تصوراتی جواز ہے۔

غلامی کا یہ جواز بارش میں کئی جگہ زیر بحث آیا ہے۔ مثلاً ناول کا ہیرو شہر یار اس غلامی سے متنفر ہے۔ اس کی ایک ٹھوس وجہ یہ بھی ہے کہ جاگیر اور جائیداد کا وارث ہوتے ہوئے بھی وہ بہت حد تک اپنی دادی کا غلام ہے۔ تاجور بیگم نے

اس کی زندگی کے ہر فیصلے کو اپنے ہاتھ میں لے رکھا تھا۔ شاید اسی لیے وہ غلامی کو نہ صرف سمجھ سکتا ہے، بلکہ اس سے نفرت بھی کرتا ہے۔ شہر یار کو اپنے ملازموں میں سے فلک شیر اچھا لگتا تھا۔ لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اسے فلک شیر سے بھی اکتاہٹ ہوگئی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ شہر یار کو ان لوگوں کی ذہنی غلامی ناپسند ہے۔ وہ تبصرہ کرتا ہے کہ ''یہ لوگ اپنے مالکوں کو ہی خدا بنائے بیٹھے ہیں۔ اطاعت کے سوا کوئی عقیدہ اور ایمان نہیں رکھتے۔''[۸] شہر یار کے شعور میں اس ناپسندیدگی کی وجہ چلتی رہتی ہے۔ الیاس نے شہر یار کے دماغ میں غلامی کے حوالے سے چلنے والے خیالات کو بیان کیا ہے۔ شہر یار غلامی کے مختلف پہلوؤں پر غور کرتا ہے اور اس کے اہم ترین جواز کو سامنے لاتا ہے۔ یہی جواز کہ محکوم خود غلامی کو قبول کرتے ہیں۔ پہلے خیال کی سطح پر اسے قبول کیا جاتا ہے۔ پھر غلام اپنے تمام اعمال اس کے مطابق ترتیب دیتا ہے۔ ان غلاموں کے رشتے ناتے بھی آقاؤں کی مرضی سے طے ہوتے ہیں۔ ان کے پسندیدہ افراد آقا کے پسندیدہ لوگ ہوتے ہیں۔ یہ کس سے وفا کریں گے اور کس سے نفرت، اس کا انحصار بھی آقا کی پسند ناپسند پر ہوتا ہے۔ یہ کلی طور پر یعنی جسمانی اور ذہنی سطح پر غلامی میں ڈوب چکے ہیں۔ اس کی ایک مثال ناول میں نایاب کے حوالے سے روشن مائی کے رویے میں سامنے آتی ہے۔ نایاب چونکہ بیگم تاجور کی ناپسندیدہ خاتون ہے تو ملازم بھی اسے پسند نہیں کرتے۔ شہر یار کی ملازمہ روشن مائی ایک مثالی لونڈی ہے۔ جس کے ہر عمل اور جملے سے غلامی ٹپکتی ہے۔ جو ہر وقت ہاتھ باندھے کھڑی رہتی ہے، جو مخاطب کرتی ہے تو ''جی سئیں'' کہہ کر، ہاتھ باندھے رکھنا، ''پاؤں پڑتی ہوں جی'' جیسے جملے بولنا ظاہر کرتا ہے کہ غلامی اس کی رگ رگ میں رچ بس چکی ہے۔ لیکن یہی مائی جب شہر یار کی بیوی، نایاب کے سامنے آتی ہے تو گردن اکڑا لیتی ہے۔ اس کی وجہ یہ کہ نایاب سے شہریار نے پسند کی شادی کی ہے اور اس کی دادی تاجور بیگم کو یہ شادی پسند نہیں۔ یہ بالکل ظاہر ہے کہ کبھی بھول کر بھی مائی نایاب کو ''میڈی سیئن'' نہیں کہتی۔ وہ اسے بیگم صاحبہ کہہ کر پکارتی ہے۔ شہر یار نوٹ کرتا ہے کہ اس کے لہجے میں ایک خاص طرح کا احساس برتری جھلکتا ہے۔ ''وہی تکبر، گھمنڈ اور غرور جو سردار خاندان کے مردوں اور خواتین میں پایا جاتا ہے۔'' یہ غرور ملازموں میں بھی منتقل ہوا، مگر صرف غیروں کے لیے۔ جیسے ہی معاملہ آقاؤں کا آتا ہے، یہ لوگ ویسے ہی وفادار جانوروں کی طرح غلام بن جاتے۔ ''اپنے آقاؤں سے سو جوتے کھا کر، ایک سو ایک بار اُن کے تلوؤں کو بوسہ دیتے۔ اوروں سے بات کرتے ہوئے شتر مرغ کی جون بدل لیتے۔ گردن اکڑ جاتی اور سینہ پھول جاتا۔''[۹] یہ مثال ثابت کرتی ہے کہ غلاموں کی عادات، خصائل، پسند، ناپسند سب کا انحصار مالکوں پر ہوتا ہے۔ یہ غلامی کی بدترین قسم ہے۔

محکومی کے اس تصوراتی جواز کے ایک اور پہلو کی طرف بھی الیاس نے توجہ دلائی ہے۔ ایک ایسی محکومی جہاں مالک کے پاس غلاموں کے حوالے سے ہر طرح کا اختیار ہو، وہاں مالک ہی خدا بن بیٹھتا ہے۔ وہ بارش میں اس صورتِ حال کو پیش کرتے ہیں، جہاں نسلی آقا ہی خدا بن گئے ہیں۔ یہ بات شہر یار کی سوچوں میں ہے۔ وہ اپنی دادی کے اختیارات اور طرزِ عمل پر غور کرتا ہے اور سوچتا ہے کہ اگر زندگی موت اللہ کے ہاتھ میں ہے، تو اس کی دادی کے ہاتھ میں اتنے اختیارات کیسے آ گئے۔ وہ غور کرتا ہے کہ اس کی دادی جس بہو سے چاہے بچے کی پیدائش ہونے دے اور جس بہو کو ناپسند کرتی ہو، اس کی کوکھ میں پلنے والے ننھے وجود کو دنیا میں آنے سے پہلے ہی موت کے گھاٹ اتار دے۔ وہ اس ساری

صورتِ حال سے یہ نتیجہ نکالتا ہے: ''گویا طاقت، دولت اور اختیار حاصل ہو تو اللہ کے اختیارات میں کھلی مداخلت کی جا سکتی ہے۔''[10] الیاس نے دکھایا ہے کہ نسلی برتری کا زعم انسان کو درندے میں بدل دیتا ہے۔ جو انسان کو انسان کی بجائے کوئی ادنیٰ مخلوق تصور کرتا ہے اور اپنے مذموم مقاصد کے راستے میں آنے والے ہر انسان کو بے دریغ ختم کر دیتا ہے۔اس ضمن میں مقتدر نسل کے حامل افراد کسی قاعدے قانون کی پرواہ نہیں کرتے۔ دین ہو یا آئین، قانون ہو یا اخلاق، ان کے لیے ہر معاشرتی قدر، ریاستی قانون اور شرعی اصول کچھ اہمیت نہیں رکھتے۔ یہ ان سب اصولوں کو بالائے طاق رکھ کر من مرضیاں کرتے ہیں۔ ہر معیار پر طے ہونے والی بدکاری، ان کے لیے جائز ہے۔ الیاس نے دکھایا ہے کہ ظالم کسی تہذیب، ترتیب یا قاعدے کو نہیں مانتے۔ انھیں بس اپنی خواہشوں اور اناؤں کی تسکین درکار ہے۔

ایک طرف یہ عالم ہے، تو دوسری طرف محکوموں نے اس بات کو عقیدے کے طور پر تسلیم کر لیا ہے، کہ مالک کا ہر حکم اٹل اور ہر فعل جائز ہے۔محکوموں کی نسل در نسل تربیت اس تصور پر ہوئی کہ ہر صورت میں مالک سے وفا دار رہنا ہی دین و ایمان ہے۔

> ''سیئں کا حکم ہی دراصل خدا کا حکم ہے۔ اس کا ہر راز اپنے سینے میں دفن کر لینا ہے۔ باپ بھی کرید کرے تو اس کو سختی سے ڈانٹ دینا ہے۔ سنبھالنے میں مشکل بن آئے تو اپنی زبان خود کاٹ کر راز اگلوانے والے کی ہتھیلی پر رکھ دینی ہے۔''[11]

اس حاکم محکوم پر مبنی نظام کی جڑیں اس تصور میں ہیں کہ ''نسل'' ہی انسانی خصوصیات کی بنیاد ہے۔ اور خون اپنا رنگ دکھاتا ہے۔ یعنی فرد کا تجربہ، اس کا وجود، زندگی اور سمجھ بوجھ اس کی شخصیت میں کوئی کردار نہیں رکھتے۔ اس کے تمام تر رجحانات کی بنیاد نسل ہے۔ یہ بات مختلف کرداروں اور ناول کا راوی مختلف مقامات پر دہراتا ہے۔نسل اتنی اہمیت کی حامل ہے کہ جانور خریدنا ہو، یا گھر میں پودا لگانا ہو، اس کی نسل کی خوب چھان پھٹک کی جاتی ہے۔ ناول کا ایک کردار صلاح دیتا ہے کہ اگر اپنی حاکمیت برقرار رکھنی ہے تو اولاد کا رشتہ کرتے ہوئے نسل کا خصوصی خیال رکھا جائے۔ اس لیے وہ صلاح دیتا ہے کہ شادیاں خاندان کے اندر ہی کی جائیں تاکہ نسل میں نجیب الطرفین بچے پیدا ہوں، اور ملاوٹ کا کوئی شائبہ نہ رہے۔ وہ بڑے واضح انداز میں کہتا ہے! ''نسل ہی اصل ہے۔ سب سے پہلا معیار یہ ہونا چاہیے۔''[12] جب نسل ہی شخصیت کی تفہیم کا اولین معیار ہے، تو پھر ناول کے بیش تر کردار اپنی نسلی برتری ثابت کرنے کے لیے مختلف افعال کا سہارا لیتے ہیں۔کہیں بعض اقدار بھی اپنی برتری کی علامت بن جاتی ہیں۔ مثلاً ایک کردار درشہوار بیان دیتی ہے کہ ''میری نسل بڑی اعلیٰ ہے۔ جس کا خاصہ یہ ہے کہ ہم لوگ اپنی دوستیاں اور دشمنیاں ہر صورت میں نبھاتے ہیں۔'' یہی بات آگے چل کر راوی بیان کرتا ہے کہ ''سردار خاندان اپنی دشمنیاں اور دوستیاں ایمان کا حصہ سمجھ کر نبھاتا ہے۔''[13] اس بیان میں اپنے تعلقات پر قائم رہنا نسلی تفاخر کا نشان بن گیا ہے۔

ایک سطح پر یہ قبائلی سوچ ہے، جس میں نسل بعد نسل دوستی ہو یا دشمنی برقرار رہتی ہے۔ کرتا کوئی ہے، بھرتا کوئی ہے تاہم یہ وہ اکھڑ مزاجی اور بنیاد پرستی ہے، جسے نسلی ہونے کا طرۂ امتیاز مانا جاتا ہے۔

تصورات کی سطح پر غلامی جواز حاصل کرتی ہے، تو اس کی ایک اور بنیاد معاشی وسائل پر کنٹرول ہے۔ الیاس نے اپنے ناولوں میں مادی وسائل پر کنٹرول کے اس سببِ خاص کا تفصیل سے ذکر کیا ہے، جو محکومی کو پیدا کرتا ہے۔ اس حوالے سے الیاس سندھ کی مثال پیش کرتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ

''سندھ کی کل زمینوں پر چالیس یا پینتالیس وڈیروں کا قبضہ ہے۔ باقی ساری دیہی آبادی، ہاری... ان کی غلام۔ عوام کی نفرت کا رخ موڑنے کے لیے کبھی آبادکار اور کبھی مہاجر کے خلاف نعرہ دے دیا۔ خود بے فکر ہو کر عیاشی میں لگے رہے۔''[۱۴]

الیاس کی خواہش ہے کہ محکومی کے اصل سبب سے ان کے پڑھنے والے واقف ہو جائیں۔ وہ اشرافیہ کے ان کھوکھلے نعروں میں نہ آئیں، جن میں آبادی کو مختلف معاشی لسانی یا مذہبی گروہوں میں بانٹ کر لڑوایا جاتا ہے اور اسی دوران وسائل پر اپنی گرفت مضبوط کر کے، اشرافیہ اپنی حیثیت مضبوط سے مضبوط تر کرتی جاتی ہے۔ وہ اس سارے فریب کا پردہ چاک کرنا چاہتے ہیں، اسی لیے لکھتے ہیں ''آج نہیں تو کل، نوجوان طبقے پر اپنی مفلسی کے اصل اسباب کھل جائیں گے۔''[۱۵] الیاس کے ناول محکومی اور غربت کے اصل اسباب پر سے پردہ اٹھانے کی کوشش ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے ناول درمیانے اور نچلے طبقے میں مقبول ہیں، کیوں کہ یہ ان کی آواز ہیں، اور ان کے لیے اپنے مصائب سے نکلنے کا راستہ بھی ہیں۔

گلِ شہوار جب وسائل کی غیر منصفانہ تقسیم پر سوال اٹھاتا ہے اس کے کھوکھلے پن کی طرف توجہ دلاتا ہے اور اسے بدلنے کی تجاویز دیتا ہے، تو سردار خاندان کے افراد کا جواب بڑا واضح ہوتا ہے کہ ''نظام'' چلانے کے لیے یہ عدم مساوات ضروری ہے۔ اگر کوئی محکوم نہیں ہوگا، تو حاکموں کے کام کون کرے گا۔ اسی مقام پر ضیاء الحق کی حکومت کا ذکر آتا ہے، جسے استحصالی طبقے پسند کرتے ہیں۔ ایک مقتدر کردار کہتا ہے ''اللہ کا بڑا کرنا ہوا کہ پکے مومن مسلمان نے حکومت سنبھال لی۔''[۱۶] ناول کے اس مقام پر مذہبی حکومت استحصالی طبقات کے لیے ایک آڑ بن کر سامنے آتی ہے۔

وسائل پر کنٹرول کی وجہ سے عورتوں کی محکومی قائم ہوتی ہے۔ جاگیردار طبقہ جہیز تو دیتا ہے، تاہم جائیداد میں حصہ نہیں دیتا۔ یہ اسی لیے ہے کہ وسائل پر اجارہ داری قائم رہے۔ عورتوں کے معاملے میں وسائل سے ہی بے دخلی ہے، جس کی وجہ سے مرد اپنی مرضی سے ان کی شادیاں کرتے ہیں۔ جیون ساتھی کے انتخاب میں بھی عورتیں بے بس نظر آتی ہیں۔ اس پر محمد الیاس طنز کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''زبردستی اور بے جوڑ کی شادی کا انجام اچھا نہیں ہوگا... یہ استحصالی طبقے کو قائم اور مضبوط رکھنے کے لیے معمول کی کاروائی ہے، تاکہ استحصال بالجبر اور ناجائز کا سلسلہ جاری رہے۔''[۱۷]

وسائل پر اس غیر منصفانہ اجارہ داری نے جس صورتِ حال کو جنم دیا ہے، الیاس نے اپنے کرداروں کے ذریعے اور ان کے مکالموں کی مدد سے اس کا جائزہ لیا ہے، اس پر تنقید کی ہے اور اسے بدلنے والوں کی بے بسی کا تماشا بھی دکھایا ہے۔ اس ''نظام'' کی بنیادیں ایسی ہیں کہ غریب آدمی کا باپ بھی اس کی زندگی میں کوئی تبدیلی نہیں لا سکتا، جبکہ امیر کا بچہ

بھی محکوموں کے لیے زندگی تلپٹ کر دینے کا ذریعہ بن سکتا ہے، پروا کا ایک کردار یار محمد سمجھاتا ہے کہ اگر کوئی ملازمت میں کامیابی حاصل کرنا چاہتا ہے، تو افسر کے چھوٹے سے چھوٹے بچے کا بھی اپنے باپ دادا سے بڑھ کر احترام کرے۔ وہ استحصالی نظام کے کل پرزوں کا جائزہ لیتے ہوئے تلخی سے کہتا ہے کہ اس ملک میں حاکم اور محکوم اصل میں دو ہی طبقے ہیں۔ ان کے مابین ایک تیسرا طبقہ بھی ہے، جسے ''بچولیا'' کہتے ہیں۔ یہ طبقہ ایسے لوگوں پر مشتمل ہے، جو خوش آمد، سفارش یا رشوت کے ذریعے مختلف مفادات حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان میں ایک طریقہ تو کسی عورت کے ذریعے افسر کو خوش کرنے کا ہے۔ یہ عورت اپنی کوئی رشتے دار بھی ہوسکتی ہے یا کسی پیشہ ور کو بھی استعمال کر سکتے ہیں۔ الیاس کے طنز کی کاٹ یہاں بہت گہری ہو گئی ہے۔ وہ مفادات کے حصول کے لیے اوچھے ہتھکنڈے استعمال کرنے والوں کو آڑے ہاتھوں لیتے ہیں۔ یہ عجیب وغریب ہے کہ وہ لکھنے والوں کو بھی دلال اور بھڑوے کی صف میں شامل کر دیتے ہیں۔ تاہم ہر لکھنے والا نہیں، بلکہ وہ لوگ جو ضمیر فروش ہیں۔ جو مقتدر طبقوں کی خوشنودی کے لیے، ان کی من چاہی تعبیریں پیش کرتے ہیں اور اپنی تحریروں کے ذریعے مال داروں کی خوشنودی حاصل کرتے ہیں۔ اس تیسرے طبقے میں الیاس نے ان مذہبی کارندوں کو بھی شامل کیا ہے، جو مال کے عوض اللہ کی آیتیں بیچتے ہیں۔ یہ اعلیٰ طبقے کا ''دست و بازو'' ہیں، جن سے رقم کے عوض جیسا چاہے فتویٰ لے لیا جائے۔ یہ لوگ حاکموں اور زور داروں کی لوٹ مار اور بداعمالیوں کے حق میں دلائل ڈھونڈتے ہیں۔[18]

پـروا میں الیاس نے دکھایا ہے کہ کس طرح اعلیٰ طبقہ معاشی وسائل پر اپنے قبضے کی وجہ سے قانون، شرع اور ریاستی اداروں کا مالک بنا بیٹھا ہے اور یہ سب ادارے اس کے سیاہ و سفید کے یرغمال بنا دیئے گئے ہیں۔ ان کے نزدیک اس ساری صورتِ حال کا حل وسائل کی منصفانہ تقسیم ہے۔

نسلی غلامی کی تصویروں کو ناولوں میں پیش کرنے اور اس کی دو بنیادی وجوہ تصوراتی اور مادی کو سامنے لانے کے بعد الیاس نے اس نظام پر بھرپور تنقید کی ہے۔ کہیں یہ تنقید مذہبی بنیادوں پر ہے، یعنی خدا نے سب انسانوں کو برابر بنایا ہے مذہب بھی مساوات کا درس دیتا ہے، تاہم چند مقتدر ہاتھوں نے مذہب کی ان تعلیمات کو پسِ پشت ڈالتے ہوئے، اپنی اجارہ داری قائم کر لی ہے۔ اس ضمن میں الیاس نے ریاستی مشینری اور ڈھانچے کو آڑے ہاتھوں لیا ہے۔ جو انصاف کی دھجیاں اڑاتا ہے۔ الیاس نے وضاحت کی ہے کہ یہ ایسا نظام ہے، جس میں قانون مجرم کی مالی حیثیت کا اندازہ لگانے کے بعد تفتیش اور سزا تجویز کرتا ہے۔ وہ بہت کھلے ڈلے انداز میں اس پر تنقید کرتے ہیں جہاں انصاف کے کئی درجے ہوں:

> ''یہ کس قسم کی ریاست ہے، جہاں طاقت ور کا اپنا قانون رائج ہے۔ اس کی منشا کے تابع رہ کر ہی جیا جا سکتا ہے۔''[19]

وہ بڑی وضاحت سے مقتدروں کا یہ فریب سامنے لاتے ہیں جس میں سب کچھ کرتے تو اعلیٰ طبقات ہیں، تاہم اسے اللہ کی مرضی قرار دے کر خود کو صاف بچا لیتے ہیں۔ ''سارے ظلم وستم یہی طبقہ کرتا ہے اور بڑی دیدہ دلیری سے اللہ کے نام تھوپ دیتا ہے۔''[20] یہ نظام اس قدر پختگی حاصل کر چکا ہے کہ اب محض انفرادی تبدیلیوں سے بات بننے والی نہیں۔

الیاس کا نقطہ نظر ہے کہ جب تک پورا نظام تبدیلی نہیں ہوتا، تب تک محض چند افراد کی باطنی تبدیل سے کچھ نہیں ہوگا۔ وہ زور دیتے ہیں کہ جن ریاستوں میں ''غیر منصفانہ اور لوٹ مار کا نظام رائج ہو، وہاں انسانی ذلتوں کی کوئی حد نہیں ہوتی۔ پچھواڑے کے باسی اوچھن پوچھن پر گزر بسر کرتے ہیں۔''[۲۱]

پروا کے اہم کردار دانیال کے ذریعے الیاس نے لوٹ کھسوٹ کے نظام پر نہ صرف تنقید کی ہے، بلکہ اسے تبدیل کرنے کے لیے راستہ بھی دکھایا ہے۔ دانیال تجویز کرتا ہے کہ غربت صرف ایک صورت میں ہی ختم کی جا سکتی ہے، جب وسائل کی منصفانہ تقسیم ہو اور اسے عملی طور پر لاگو کرنے کے لیے ''کھلی لوٹ مار'' پر پابندی عائد کی جانی ضروری ہے۔ دانیال ساتھ ہی یاد دلا دیتا ہے کہ اگر لوٹ مار کے راستے بند کر دیے گئے تو امیروں کی عیاشی کے دروازے بھی بند ہو جائیں گے۔ ظاہر ہے وہ اس کو کسی صورت برداشت نہیں کریں گے۔ اس لیے دانیال توجہ دلاتا ہے کہ اسے آسان راستہ نہ سمجھا جائے کہ کہہ دیا اور ہو گیا۔ دانیال کی گفتگو سے ایک اور بات سامنے آتی ہے کہ غریبوں سے ہمدردی صرف ایک پرکشش نعرہ ہے، جسے مراعات یافتہ طبقے کے ذہین دماغوں نے پھیلا رکھا ہے۔ وہ لوگ اس نعرے کو بطور ہتھیار استعمال کرتے ہیں۔ جب غربت ختم ہو تو یہ ہتھیار بھی ختم ہو جائے گا۔ دانیال اپنے آئیڈیل کے طور پر لنین کو پیش کرتا ہے۔ اس مثال سے الیاس کی مارکس پسندی سامنے آتی ہے۔ وہ لینن کو ایک ایسے دیوانے کے طور پر پیش کرتے ہیں، جو اعلیٰ طبقے سے تعلق رکھنے کے باوجود اور صدارت کی نشست پر براجمان ہوتے ہوئے بھی عام لوگوں کی طرح مزدوروں کی بستی کے اندر ایک کمرے کے گھر میں رہتا ہے۔

الیاس غیر مصنفانہ نظام کی بنیادوں کو چیلنج کرتے ہیں۔ وہ واضح بیان دیتے ہیں کہ اس نظام میں انسانوں کی اہمیت ان کے مرتبے کی وجہ سے ہے۔ کوئی شخص اپنے معاشی مقام کی وجہ سے اعلیٰ مانا جاتا ہے، تو کسی کی نسلی برتری اسے سردار بنا دیتی ہے۔ وہ اس پیمانے کو ''سرا سر جعلی'' کہتے ہیں۔ ان کے خیال میں یہ نرا ظلم ہے۔

اس ساری بحث سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ الیاس ظلم و ستم پر مبنی نظام کے ناقد ہیں۔ وہ ہر سطح پر ہونے والے ظلم کے خلاف آواز اٹھاتے ہیں۔ ان کے ناولوں میں ایک طرف اعلیٰ طبقات کے ظلم کو سامنے لایا گیا ہے، تو دوسری محکوموں پر بھی تنقید کی گئی ہے کہ وہ خود خیال کی سطح پر حاکموں کی برتری تسلیم کرتے ہیں اور جانوروں کی سطح پر زندگی گزارتے ہیں۔ اس بے انصاف نظام کی دو بنیادوں کی طرف الیاس نے توجہ دلائی ہے: ایک تصورات اور دوسرا معاشی وسائل۔ الیاس کے نزدیک یہ سماج میں پھیلائے گئے مختلف خیالات ہیں، جنہیں کبھی نسل نام کے پر اور کبھی سماج کے نام پر افراد کے ذہنوں میں ڈال دیا جاتا ہے۔ رفتہ رفتہ محکوم اپنی حیثیت مان لیتے ہیں۔ جس کا سرا سر فائدہ حاکموں کو ہوتا ہے، جنھیں نسل در نسل غلامی کرنے والے ملازم مل جاتے ہیں۔ اس بے انصاف نظام کی دوسری بڑی بنیاد مادی وسائل پر کنٹرول ہے۔ الیاس دکھاتے ہیں کہ کس طرح بیگم تاجور بڑی جائیداد کی مالکن ہونے کے ناطے فرعون بنی ہوئی ہے۔ جسے اپنے پوتے کی تمناؤں سے کوئی سروکار نہیں، جو بس حکم چلانا جانتی ہے۔ اس کردار کے ذریعے اور دیگر زورداروں کو دکھا کر وہ ثابت کرتے ہیں کہ ان سب کی سرداری محض وسائل پر کنٹرول کی وجہ سے قائم ہے۔ یہ کنٹرول مرد کو عورت پر حاکم بناتا ہے اور عورت کو مرد پر۔

جس کے ہاتھ میں وسائل ہوں گے، وہی اجارہ دار بنے گا۔ پاکستانی سماج کی صورتِ حال کی تصویر کشی کے ساتھ ساتھ وہ اسے بدلنے کے لیے آواز بھی اٹھاتے ہیں اور حل تجویز کرتے ہیں کہ وسائل کی منصفانہ تقسیم اور لوٹ کھسوٹ کی روک تھام دو ایسے اقدام ہیں، جن کی مدد سے غربت ، جہالت اور استحصالی نظام کو آسانی ختم کیا جا سکتا ہے۔

## حواشی و حوالہ جات

۱۔ محمد الیاس، بارش (لاہور : سنگ میل پبلی کیشنز،۲۰۱۲ء)،ص ۱۸۔

۲۔ ایضاً،ص۷۔

۳۔ ایضاً،ص۸۔

۴۔ ایضاً،۲۸۔

۵۔ ایضاً،ص۴۴۔

۶۔ ایضاً،۱۲۵۔

۷۔ ایضاً،۶۵۷۔

۸۔ ایضاً،ص۴۰۵۔

۹۔ ایضاً،۴۰۶۔

۱۰۔ ایضاً،ص۴۵۰۔

۱۱۔ ایضاً،ص۶۵۷۔

۱۲۔ ایضاً،ص ۶۸۵۔

۱۳۔ ایضاً،ص۷۔۱۴۷

۱۴۔ ایضاً،ص۲۱۷۔

۱۵۔ ایضاً،ص۲۱۷۔

۱۶۔ ایضاً،ص۲۹۷۔

۱۷۔ ایضاً،ص۳۶۰۔

۱۸۔ ایضاً،ص۴۲۔

۱۹۔ ایضاً،ص۴۰۔

۲۰۔ ایضاً،ص۵۴۵۔

۲۱۔ محمد الیاس، پروا (لاہور : سنگ میل پبلی کیشنز،۲۰۱۳ء)،ص۳۳۔